بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

عوامی فلاح کے مسائل اور اقامتِ دین

سلیم منصور خالد

بعض احباب یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ''شہری زندگی کے مسائل اور لوگوں کی دنیاوی مشکلات حل کرانے کی جدوجہد کا اقامتِ دین سے بھلا کیا تعلق ہے؟'' پھر کچھ کرم فرما یہ بھی پوچھتے ہیں کہ ''جماعتِ اسلامی تو معاشرے کی اصلاح اور شہادتِ حق کے لیے قائم ہوئی تھی، مگر یہ سڑکوں کی تعمیر، بجلی اور پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کے خلاف اپنی قوتیں لگانے کا جماعت کے مقصدِ تاسیس وتحریک سے کیا تعلق بنتا ہے؟'' یہ اور اس نوعیت کے سوالات اخلاص سے بھی کیے جاتے ہیں اور حکمت عملی سے گہری بے خبری کی بنا پر بھی زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ سوالات سنجیدہ غوروفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

اصولی طور پہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اقامتِ دین کے لیے کوشاں اسلامی تحریک کے لیے عوام کے مسائل، تکالیف اور ان پر سرکاری وغیرسرکاری مظالم کے خلاف آواز اٹھانا نہ صرف ایک دینی تقاضا ہے، بلکہ انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت اور اسلامی دعوت و انقلابی جدوجہد کا لازمی جزو بھی ہے۔ اس عمل کو اقامتِ دین کی جدوجہد سے غیرمتعلق سمجھنا، دین اور دین کے جامع اور ہمہ گیر تصور سے کماحقہٗ آگہی نہ ہونے پر مبنی واہمہ ہے۔ اسلام کسی ایسی تفریق کو قبول نہیں کرتا جہاں کچھ مخصوص اعمال کو 'دینی'، جب کہ خلقِ خدا کی خدمت اور مظلوم کی حمایت اور دادرسی کو 'غیر دینی' سمجھا جائے۔

اس موقف کو سمجھنے کے لیے قرآن، سیرتِ طیبہؐ اور اسلامی تاریخ پر مختصراً نظر ڈالتے ہیں:

□ قرآنِ کریم کی تعلیم

● ظلم کے خلاف عوام کے حقوق کے لیے آواز اٹھانا: قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے

عام انسانوں اور کمزور طبقوں (مستضعفین) کے حقوق اور ان کے دکھ درد پر آواز اٹھانے کو دین اسلام کا لازمی تقاضا قرار دیا ہے: وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ (النساء ۴:۷۵) ''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں''۔ [یہاں مستضعفین، یعنی مظلوم عوام کی پکار پر لڑنے کو قتال فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔]

● ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی دعوت: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ (النساء ۴:۱۴۸) ''اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ برائی کو علانیہ زبان پر لایا جائے، سوائے اس کے جس پر ظلم ہوا ہو''۔ [یعنی مظلوم کو حق پہنچتا ہے کہ ظالم کے خلاف آواز بلند کرے]۔

● اللہ تعالیٰ نے اُن عبادت گزاروں کی مذمت کی جو عوام کے دکھ سے غافل ہیں:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰي طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ (الماعون ۱۰۷:۱-۳) تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اُکساتا۔ [یعنی یتیم اور مسکین کے دُکھ سے بے حسی کو اللہ نے تکذیبِ دین قرار دیا ہے۔]

اس طرح قرآن کریم معاشی استحصال اور معاشرتی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے کو اقامتِ دین کی جدوجہد سے الگ نہیں کرتا، بلکہ اس جدوجہد کے لازمی جزو کے طور پر بیان کرتا ہے۔

□ **انبیاءؑ کی سنت**

تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے توحید پر مبنی اسلامی معاشرے کے قیام یا دوسرے لفظوں میں اقامتِ دین کی دعوت اور جدوجہد میں اپنے اپنے دور کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مظالم اور عوام کی تکالیف کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے ان کی اصلاح کی کوشش فرمائی۔

● حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی خدائی کے انکار کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل پر ہونے

والے جسمانی وسیاسی مظالم اور غلامی سے نجات کی جدوجہد کی۔ یہ آپ کی دعوت کا نمایاں پہلو تھا۔

● حضرت شعیب علیہ السلام نے دعوتِ توحید کے لازمی جزو کے طور پر ناپ تول میں کمی، معاشی بدعنوانی اور ڈاکا زنی کے خلاف آواز اٹھائی، جو ان کی قوم کے عامۃ الناس کا بہت بڑا معاشی ومعاشرتی دُکھ تھا۔

□ **سیرتِ نبویؐ سے مثال**

● حلف الفضول: نبوت سے پہلے آپؐ نے 'حلف الفضول' معاہدے میں شرکت کی۔ یہ معاہدہ معاشی اور سماجی استحصال کے شکار لوگوں کو ظلم اور زیادتی سے بچانے کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔ اس معاہدے کا مقصد یہ تھا کہ مکہ میں کسی بھی مظلوم، چاہے وہ غریب ہو یا باہر سے آیا ہوا مسافر اور تاجر، اس کی مدد کی جائے گی۔ آپؐ نے اس معاہدے میں شرکت فرمائی تھی، اور آپؐ نے نبوت کے بعد بھی یہ فرمایا: ''میں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک ایسے معاہدے میں شریک تھا کہ اگر اس کے عوض مجھے سرخ اونٹ بھی دیے جاتے تو میں نہ لیتا، اور اگر اسلام میں بھی مجھے ایسے معاہدے کی طرف بلایا جائے تو میں ضرور لبیک کہوں گا''۔ (مسند احمد، بیہقی، ابن ہشام)

● شعبِ ابی طالب: جب شعب ابی طالب میں عام مسلمان بھوک اور قریشِ مکہ کے بائیکاٹ کا شکار تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاؓ کے ساتھ اسی طرح فاقہ کشی کی۔ آپؐ نے یہ نہیں کہا کہ میرا کام صرف توحید کی دعوت ہے، تمھاری بھوک تمھارا دنیاوی معاملہ ہے۔

اس طرح مدنی دور سے پہلے، مکی دور میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید کے لازمی جزو کے طور پر مفلسوں، ناداروں، غلاموں اور کمزوروں کی دادرسی اور قریش کے استحصالی افراد کے خلاف گواہی بھی مرکزی طور پر دکھائی دیتی ہے۔

□ **خلفائے راشدینؓ کا طرزِ عمل**

خلفائے راشدینؓ کا پورا زمانہ اس فکرمندی اور احساسِ ذمہ داری کی جیتی جاگتی مثال تھا کہ عوام کے دکھ درد کا خیال کرتے ہوئے اُسے دُور کرنے اور شہریوں کو راحت دینے کے انتظام وانصرام کو یقینی بنایا جائے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ راتوں کو بھیس بدل کر مدینہ کی گلیوں میں گشت کرتے تھے کہ کوئی بھوکا تو نہیں سویا، کسی بیوہ کو آٹا تو نہیں چاہیے۔ ایک دفعہ ایک عورت بچوں کو بہلانے کے لیے خالی ہنڈیا چولہے پر چڑھائے ہوئے تھی، جب آپؓ کو معلوم ہوا تو آٹا خود اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے۔ قحط کے زمانے میں حضرت عمرؓ نے اپنے لیے گوشت اور گھی کو ممنوع قرار دے لیا تھا۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا طرزِعمل: عام الرمادہ (قحط کے سال) میں حضرت عمرؓ نے عوام کی تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''اگر فرات کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی بھوک سے مرجائے تو عمر سے اس کی پوچھ گچھ ہوگی''۔

یہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے مطلوب خلافت راشدہ کے نظامِ حکومت کے سربراہ کا طرزِعمل تھا۔ خلفائے راشدینؓ عوام کی فلاح و بہبود کو رسولؐ اللہ کی اقتدا میں اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ گویا عامۃ المسلمین کی مشکلوں کو حل کرنے کی جدوجہد اقامتِ دین کی جدوجہد کا لازمی جزو ہی نہیں، ایک اہم مقصد ہے، بلکہ ایک اسلامی اور عادلانہ نظامِ حکومت کا اس کے سوا اور کیا مقصد ہوسکتا ہے کہ ہر حق دار کو اُس کا حق پہنچایا جائے، اور ہر ظالم کو اس کے ظلم سے روک کر مخلوقِ خدا کو محفوظ بنایا جائے۔

اس ضمن میں سیّدنا ابوبکرؓ کے اوّلین خطبۂ خلافت کے یہ الفاظ یاد کیجیے: ''تم میں جو کمزور ہے، میرے نزدیک قوی ہے، یہاں تک کہ مَیں اس کا اسے حق دلا دوں، اور تم میں سے جو طاقت ور ہے، وہ میرے نزدیک کمزور ہے جب تک میں اس سے حق وصول نہ کرلوں''۔ اس اصول کا: ''تقاضا یہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد اُن لوگوں کی دل سے عزّت کرے، جن کے حقوق ابھی ملنے ہیں۔ ان کے حقوق کی حمایت کرنا، ان کو ادا کرنے کی تلقین کرنا اور ان کو حاصل کرنے کے لیے سینہ سپر ہونا ہر باحمیت مسلمان کا فرض ہے''۔ (تدبر قرآن، ج ۸، ص ۵۸۳)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دور میں زکوٰۃ کا نظام ایسا قائم کیا کہ زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ رہا۔ ظاہر ہے کہ اس نظام نے عام لوگوں کے دُکھ درد، معاشی استحصال اور ان کے ساتھ ہونے والی ہر طرح کی ناانصافی ہی کو ختم کیا تھا۔

□ **ائمہ کا طرزِ فکر و عمل**

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ''مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے بے جا طور پر عوام کے مسائل ومشکلات کے حل کی کوشش کو اقامتِ دین کی جدوجہد کا حصّہ بنا دیا''۔ امر واقعہ یہ ہے کہ سیّد مودودی نے کوئی نیا کام نہیں کیا۔ انھوں نے دراصل اُمت کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ (م: ۷۶۷ء) اور ان کے شاگرد امام ابویوسفؒ (م: ۷۹۸) کا عملی رویہ حکومتِ وقت کے ساتھ تعاون کے بارے میں بالکل متضاد رہا۔ استاد نے ظالم حکمران اور اقتدار سے دُوری اختیار کی، جب کہ شاگرد نے اصلاح کی طرف مائل حکمران کی دعوت پر اقتدار میں شامل ہوکر اصلاحِ احوال کی کوشش کی۔ ان دونوں رویوں کا مقصد عوام کو حکومتی مظالم سے بچانا اور حقوق کی فراہمی یقینی بنانا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ نے عباسی حاکم ابوجعفر منصور کی پیش کش پر قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا، جس پر منصور نے انھیں کوڑے لگوائے اور سرعام سزائیں دیں۔ ان کا موقف تھا کہ اقتدار کے قریب ہوکر ظالم حکمران کے فیصلوں پر شرعی مہر لگانے سے بہتر ہے کہ میں آزاد رہ کر حق بات کہوں۔ روایات کے مطابق انھوں نے اقتدار کے ظلم کے سامنے سمجھوتا کرنے کی بجائے عملاً قید وابتلا کو ترجیح دی۔

امام ابویوسفؒ نے اس کے برعکس راستہ اپنایا۔ وہ ہارون الرشید کے دورِ خلافت میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے، اور اسی حیثیت سے انھوں نے نظام کے اندر رہ کر نظام کی اصلاح کی۔ اپنی مشہور تصنیف کتاب الخراج میں انھوں نے ٹیکس کے نظام، زمین کی ملکیت، اور عوام پر عائد محصولات کے شرعی اصولوں کو منضبط کیا۔ کتاب الخراج میں وہ صراحتاً لکھتے ہیں کہ عمال اور جمع کنندگانِ خراج کو رعایا پر نرمی کرنی چاہیے، کسی فرد کی استطاعت سے زیادہ ٹیکس نہیں لینا چاہیے، اور ظلم وزیادتی کرنے والے اہلکاروں کا احتساب کیا جانا چاہیے۔

اس سلسلے میں ابن تیمیہؒ (۱۳۲۸ء) کا زاویۂ نظر ایک مختلف تاریخی وفقہی پس منظر رکھتا ہے۔ وہ ساتویں صدی ہجری کے ایک فقیہ ومحدث تھے۔ عوام پر مظالم اور حکمرانوں کے استحصال پر ان کا موقف نہایت واضح اور مضبوط ہے۔ ان کی مشہور کتاب السیاسة الشرعیة فی إصلاح الراعی والرعیة کا بنیادی موضوع ہی حکمران اور رعایا کے تعلق میں عدل کا

سوال ہے۔ ان کا مشہور فرمان ہے:

فَإِنَّ النَّاسَ لَمْ يَتَنَازَعُوا فِي أَنَّ عَاقِبَةَ الظُّلْمِ وَخِيمَةٌ، وَعَاقِبَةَ الْعَدْلِ كَرِيمَةٌ، وَلِهَذَا يُرْوَى: اللَّهُ يَنْصُرُ الدَّوْلَةَ الْعَادِلَةَ وَإِنْ كَانَتْ كَافِرَةً، وَلَا يَنْصُرُ الدَّوْلَةَ الظَّالِمَةَ وَإِنْ كَانَتْ مُؤْمِنَةً (مجموع الفتاوی، ج ۲۸، ص ۱۲۸) بے شک لوگوں کا اس بات میں کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا کہ ظلم کا انجام برا (وخیم) ہے اور عدل کا انجام عمدہ (کریم) ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ روایت کیا جاتا ہے: اللہ عادل ریاست کی مدد فرماتا ہے اگرچہ وہ کافر ہو، اور ظالم ریاست کی مدد نہیں فرماتا اگرچہ وہ مومن ہو۔

ان کے نزدیک حکمرانی کا مقصد ہی رعایا کے دُنیوی واُخروی مفاد کی حفاظت ہے، اور جو حکمران عوام پر ظلم کرے وہ اپنی ذمہ داری پوری نہ کرنے کا مرتکب ہے۔

ابن تیمیہؒ نے اس بات کو بہت وضاحت کے ساتھ اُجاگر کیا کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ محض انفرادی گناہوں تک محدود نہیں، بلکہ حکمرانوں کے مظالم اور بیت المال کی بدانتظامی کی اصلاح بھی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا دائرۂ کار ہے۔ ان کے رسائل میں ٹیکس کے ظالمانہ نظام، غیرشرعی محصولات اور عوام پر زیادتی کرنے والے عہدیداروں پر سخت تنقید ملتی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ کی فکر میں سیاسی استحکام اور فتنے سے اجتناب کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، یعنی ظالم حکمران کے خلاف مسلح بغاوت کو وہ عموماً ناپسند کرتے ہیں، کیونکہ اس سے بڑا فتنہ اور خوں ریزی جنم لے سکتی ہے۔ یہ موقف ان کی مشہور کتاب الصبر علی جور الأئمة خیر من الخروج علیهم میں ملتا ہے۔ آواز اٹھانے اور نصیحت کرنے کو وہ درست بلکہ واجب سمجھتے ہیں، مگر مسلح بغاوت کو آخری اور اکثر ناپسندیدہ راستہ قرار دیتے ہیں۔

ابن تیمیہؒ عوام کے دُکھ پر آواز اٹھانے کو حکمران کی جواب دہی، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے اصول کے تحت نہ صرف جائز بلکہ واجب سمجھتے ہیں، مگر اس کا اظہار وہ نصیحت اور علمی احتساب کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں، نہ کہ مسلح بغاوت کی صورت میں۔ اس ضمن میں ان کی کتاب الحسبه [نظامِ احتساب] دیکھی جاسکتی ہے۔

اسی طرح اٹھارھویں صدی میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ بھی معاشی استحصال کے خلاف بیداری پیدا کرتے ہیں اور حکمرانوں کو معاشی ظلم ختم کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ پھر ۱۹ویں صدی کے دوران بنگال میں 'فرائضی تحریک'، دودھومیاں اور شہید تیتو میر کی تحریکیں بھی معاشی استحصال سے نجات پانے کے لیے انگریز اور ہندوزمین داروں سے ٹکرا جاتی ہیں۔

اس پس منظر کے ساتھ سیّد مودودی کے نزدیک اسلام محض چند مذہبی رسومات کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل 'نظامِ حیات' ہے، جس میں بنیادی عقائد، ارکان اسلام، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، نوافل، اذکار، تزکیہ، دعوتِ دین اور خدمت خلق کے ساتھ ساتھ حکومتی و ریاستی نظام، عوام کی خدمت اور حق گوئی پر مبنی سیاست، معاشی و معاشرتی عدل، بین الاقوامی تعلقات، بنیادی انسانی حقوق، اور معاشرہ و معاشرت سب شامل ہیں۔ چنانچہ، عوام کا معاشی استحصال اور سماجی فساد دراصل غلط حکومتی، ریاستی اور انتظامی نظام کا نتیجہ ہیں، اور اس فساد کا اصل حل نظام کی تبدیلی (اقامتِ دین) میں ہے۔

انھوں نے اصلاح احوال کے لیے زور تدریجی، دستوری اور تحریکی جدوجہد پر دیا، یعنی دعوتِ حق، افراد کی اصلاح، منظم تنظیم و تحریک، اصلاحِ معاشرہ اور پُرامن سیاسی جدوجہد کے ذریعے نظام کی تبدیلی۔ عوامی مسائل پر آواز اٹھانا اس پورے عمل کا حصّہ ہے۔ وہ بالکل الگ تھلگ کسی 'سوشل ایکٹوازم' کے بجائے نظام کی اصلاح کو دعوت، تربیت، تنظیم کے دائرے سے مربوط رکھتے ہیں۔ 'تحریکِ اسلامی' کی اصطلاح خود اس بات کی غماز ہے کہ ان کے نزدیک اجتماعی، منظم اور سیاسی جدوجہد ہی عوامی دکھوں کے مستقل حل کا راستہ دکھاتی اور بناتی ہے۔ وہ انفرادی یا وقتی احتجاج پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ اس شعور کو مسلسل تازہ و بیدار رکھتی ہے۔ اگر ظلم حد سے بڑھ جائے تو پھر ایک ہدف کے طور پر اُس مسئلے کے حل پر زیادہ قوت صرف کر دینا کوئی غیر تحریکی اقدام نہیں ہے۔

مولانا مودودیؒ نے جماعت اسلامی کو صرف مسجد و منبر تک محدود تحریک نہیں بنایا، بلکہ انھوں نے صاف لکھا ہے کہ اسلامی تحریک کو شہادتِ حق کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ شہادتِ عدل بھی دینی ہے۔ معاشی، سماجی اور سیاسی استحصال کے خلاف سینہ سپر ہو کر حق کی آواز بھی بلند کرنی ہے۔ اس مقصد کے لیے مزدور کی مزدوری، کسان کی فصل کے نرخ، اور بازار میں مہنگائی پر بات کرنی ہوگی۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے تدبر قرآن میں لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (الحدید ۵۷:۲۵) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

رسولوں اور [الہامی] کتابوں کے بھیجنے کا مقصد واضح ہے کہ اللہ نے اپنے رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں کہ لوگ زندگی کے ہر شعبے میں حق و عدل کے اختیار کرنے والے بنیں۔ عقائد میں وہ راہ اختیار کریں جو ہر کج پیچ سے پاک ہو، سیدھی اور بیچ (وسط) کی راہ ہو، اور اعمال میں، خواہ وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہوں یا اجتماعی زندگی سے، وہ روش اختیار کریں جو حق و عدل پر مبنی اور ظلم و جَور کے ہر شائبے سے پاک ہو۔ معلوم ہوا کہ اللہ نے اپنے رسول محض وعظ سنا دینے کے لیے نہیں بھیجے، اور نہ اپنی کتابیں محض تلاوت کے لیے نازل کیں، بلکہ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کی راہ نمائی میں حق و عدل پر قائم رہنے والے اور اس کو قائم کرنے والے بنیں [ج ۷، ص ۲۲۹]۔ قیامِ قسط [کا] یہ کام مجرد وعظ و تذکیر اور انذار و تبشیر سے نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے طاقت کی بھی ضرورت ہے‘‘ (ایضاً، ص ۲۳۰)

مولانا اصلاحی نے اسلامی ریاست میں یہ بھی لکھا ہے کہ اسلامی ریاست کی پہلی ذمہ داری فلاحِ عامہ ہے۔ روٹی، کپڑا، انصاف اور ظلم کا خاتمہ ہے۔ مہنگائی، ذخیرہ اندوزی اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے۔ کسان، مزدور اور چھوٹے تاجر کے معاشی دُکھ کو قرآن کی روشنی میں اجاگر کرنا چاہیے۔ صرف تقریر کے ذریعے نہیں، بلکہ عملی خدمت کے ذریعے جیسے قرض حسنہ، تعلیم اور علاج میں مدد کے ذریعے۔ عوام کے دُکھ پر آواز اٹھانے کو غیر دینی بات کہنا تو دُور کی بات ہے، بلکہ یہ تو دین کا لازمی تقاضا ہے۔ جو تحریک صرف اقتدار کی بات کرے اور عوام کی بھوک، ننگ اور ظلم پر خاموش رہے، وہ قرآن کی ہدایت سے رُوگردانی کی زد میں آتی ہے۔

اسی طرح سیّد قطب شہید کے نزدیک موجودہ نظام محض ناقص نہیں بلکہ 'جاہلیت' کا مظہر ہے۔ گویا مغربی و مسلم دونوں طرح کے حکمران، نظام اسلامی کے اصولوں سے مکمل انحراف پر مبنی نظام چلا رہے ہیں۔ عوام کا معاشی و سماجی استحصال اسی جاہلی نظام کی لازمی پیداوار ہے۔ عوامی دُکھ کی جڑ محض معاشی بدانتظامی نہیں، بلکہ یہ اس لیے ہے کہ انسان نے اللہ کی حاکمیت پر مبنی نظام کو چھوڑ کر

خود ساختہ نظام اپنا لیا ہے۔ اس لیے جاہلیت سے مکمل قطع تعلق کر کے انقلابی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

اقامتِ دین: ہمہ پہلو جدوجہد

اقامتِ دین کی جدوجہد میں درج ذیل دونوں پہلو نمایاں مقام اور یکساں اہمیت رکھتے ہیں:

- دعوتی و نظریاتی پہلو: درست ایمان، اللہ کی حاکمیت اور فلاحِ آخرت کی دعوت۔ ارکانِ اسلام یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج میں باقاعدگی اور دل کی حضوری، شخصی اور سماجی تربیت۔
- سماجی و معاشرتی پہلو: ہر قسم کے ظلم، مہنگائی، بے روزگاری، رشوت اور کرپشن کے خلاف عوام کے ساتھ کھڑا ہونا۔

اگر اس جامع جدوجہد میں سے دوسرا پہلو نکال دیا جائے تو اسلام کی دعوت اور تحریک کی جدوجہد عوام میں اجنبی ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس تحریک نے عوام کے دکھ کو اپنا دکھ نہ سمجھا، عوام بھی اس کے دکھ کو اپنا دکھ نہ سمجھیں گے۔ اور جس نے عوام کے آنسو پونچھے، اللہ اسی کے ذریعے دین کو قائم کرے گا۔

□ عوام کے دکھ پر آواز نہ اٹھانے کا دینی نقصان: اگر اقامتِ دین کی تحریک عوام کے دکھ درد، معاشی استحصال، مہنگائی، ناانصافی اور جبر سے بے نیاز ہو جائے تو:

- عام لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی تحریک ان کی عملی زندگی اور مسائل سے لاتعلق ہیں، بلکہ استحصالی طبقوں اور استحصالی نظام کے خاموش طرف دار بھی۔
- دین صرف چند عبادات، نعروں اور انفرادی ذکر و فکر تک محدود نظر آنے لگتا ہے، حالانکہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتا ہے۔
- انبیائے کرام نے ہمیشہ عوام کے دل ان کے مسائل میں شریک ہو کر اور ان سے ہمدردی کر کے جیتے۔

اس اعتبار سے عوام کے دکھ درد، معاشی و معاشرتی مسائل اور ان پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھانا نہ صرف ایک اسلامی فریضہ ہے، بلکہ اقامتِ دین کی تحریک کے لیے روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ مظلوم کی حمایت اور عوام کی خدمت کے بغیر اقامتِ دین کی کوئی

جدوجہد کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس لیے یہ تصور درست نہیں ہے کہ اقامتِ دین کا کام اور عوام کے دکھ پر آواز اٹھانا دو الگ چیزیں ہیں۔ بلکہ اسلام میں عوام کے دکھ پر آواز اٹھانا عین اسلامی کام ہے، اور اقامتِ دین کی جدوجہد اس کے بغیر نامکمل ہے۔

اس اصولی صورتِ حال کو مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں یوں بیان فرمایا ہے:

انبیا علیہم السلام کو جس مقصد کے لیے بھیجا گیا وہ یہ تھا کہ دُنیا میں انسان کا رویہ اور انسانی زندگی کا نظام فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی، عدل پر قائم ہو۔ ایک طرف ہر انسان اپنے خدا کے حقوق، اپنے نفس کے حقوق اور ان تمام انسانوں بلکہ تمام مخلوقات کے حقوق، جن سے اس کو کسی طور پر سابقہ پیش آتا ہے، ٹھیک ٹھیک جان لے اور پورے انصاف کے ساتھ ان کو ادا کرے۔ اور دوسری طرف اجتماعی زندگی کا نظام ایسے اصولوں پر تعمیر کیا جائے، جن سے معاشرے میں کسی نوعیت کا ظلم باقی نہ رہے، تمدن و تہذیب کا ہر پہلو افراط و تفریط سے محفوظ ہو، حیات اجتماعی کے تمام شعبوں میں صحیح صحیح توازن قائم ہو، اور معاشرے کے تمام عناصر انصاف کے ساتھ اپنے حقوق پائیں اور اپنے فرائض ادا کریں۔ بالفاظِ دیگر انبیا علیہم السلام کی بعثت کا مقصود عدلِ انفرادی بھی تھا اور عدلِ اجتماعی بھی۔ وہ ایک ایک فرد کی شخصی زندگی میں بھی عدل قائم کرنا چاہتے تھے، تاکہ اس کے ذہن، اس کی سیرت، اس کے کردار اور اس کے برتاؤ میں توازن پیدا ہو۔ اور انسانی معاشرے کے پورے نظام کو بھی عدل پر قائم کرنا چاہتے تھے، تاکہ فرد اور جماعت [معاشرہ] دونوں ایک دوسرے کی روحانی، اخلاقی اور مادی فلاح میں مانع و مزاحم ہونے کے بجائے معاون و مددگار ہوں۔ (الحدید، حاشیہ ۲۵، ص ۳۲۲)

گویا اقامتِ دین کا مطلب معاشرتی، سماجی، معاشی اور سیاسی، غرض زندگی کے ہر شعبے میں دین قائم کرنے کی ہمہ پہلو جدوجہد ہے، اور یہ کہ دین کا بنیادی مقصد اللہ کی بندگی، انفرادی و اجتماعی تقویٰ و تزکیہ اور انسانوں کو ظلم، جبر اور قہر سے نجات دلانا ہے۔